اسلام کا سیاسی نظام ☆

خالد سیف اللہ رحمانی

الحمد لله رب العالمين ، والصلا ة والسلام على سيد الانبياء والمرسلين ،
وعلى آله وأصحابه اجمعين ، ومن تبعهم بإحسان إلى يوم الدين .

صدر عالی قدر، علماء کرام، دانشوران ذی احترام اور اساتذہ وطلباء !

اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک ایسی جاندار اور ذی شعور مخلوق بنایا ہے، جس کی فطرت میں تمدن ہے، اس کی ضروریات ایک دوسرے سے متعلق ہیں اور اس کے مزاج میں یہ بات داخل ہے کہ وہ مختلف لوگوں کے ساتھ مل کر زندگی گذارے اور مسائل کو حل کرے، مسائلِ زندگی کی تنظیم کے بنیادی طور پر دو دائرے ہیں، ایک دائرہ اپنے گھر اور خاندان کا ہے، اس کی تنظیم کو علماء فلسفہ نے 'تدبیر منزل' سے تعبیر کیا ہے، دوسرا دائرہ ایک پورے شہر یا ملک کو شامل ہے، جس کی تنظیم کو 'سیاست مدن' سے تعبیر کیا گیا ہے۔

یہ کہنا دشوار ہے کہ انسانی تمدن میں پہلی بار کوئی سلطنت کب وجود میں آئی اور کسی سیاسی نظام نے کب عملی شکل اختیار کی؛ لیکن زمانۂ قدیم سے سیاست کو ایک علمی وفنی شکل دینے کی جو کوشش ہوتی رہی ہے، اس کا سراغ ضرور ملتا ہے اور اس سلسلے میں سب سے پہلے 'سقراط' کا نام لیا جاتا ہے، جس نے گرچہ اس موضوع پر قلم نہیں اُٹھایا؛ لیکن اس نے اپنے شاگرد 'افلاطون' کو زبانی تعلیم دی، پھر افلاطون نے اپنے استاذ کی فکر کو لے کر اور اس میں اپنے افکار کا اضافہ کر کے ''جمہوریہ'' (Republic) تالیف کی، جو چار سو سال قبل مسیح کی کتاب بتائی جاتی ہے اور جسے سیاست کے موضوع پر اولین کتاب مانا گیا ہے، پھر افلاطون کے شاگرد ارسطو آئے اور اپنے استاذ کے سائنسی اور فکری افادات کو مختلف شعبوں میں مرتب کیا، جس میں ایک کتاب سیاست کے موضوع پر ''سیاست'' ہی کے نام سے ہے، اس لئے علم سیاست کے ماہرین قریب قریب اس پر متفق ہیں کہ علم سیاست پر بعد میں جو کچھ لکھا گیا یا سوچا گیا، اس کا سرچشمہ افلاطون اور خاص طور سے ارسطو کی یہی تالیف ہے۔

☆ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبۂ قانون کے اشتراک سے اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا نے ''اسلام کا سیاسی نظام'' کے موضوع پر ایک سیمینار منعقد کیا تھا، یہ اس کا کلیدی خطبہ ہے۔

یہ بات اس لحاظ سے تو قابل تسلیم ہے کہ خاص اس موضوع پر جو قدیم ترین فکری ماخذ اہل علم کے سامنے موجود ہے، وہ یہی ہے؛ لیکن یہ سمجھنا درست نہیں ہوگا کہ اس سے پہلے انسان علم سیاست سے بالکل بے بہرہ تھا؛ کیوں کہ پہلے انسان حضرت آدم علیہ السلام ہی سے وحی کا نزول شروع ہو چکا تھا، انبیاء پیدا ہوتے رہے اور آسمانی کتابیں بھیجی جاتی رہیں، اللہ کی طرف سے انسان کو جو دین عطا کیا گیا ہے، وہ زندگی کے تمام انفرادی واجتماعی مسائل کا احاطہ کرتا رہا ہے، ان آسمانی کتابوں میں قدیم زمانہ سے بہت سے عادل اور ظالم حکمرانوں کا بھی ذکر آیا ہے، بعض ایسے فرمانرواؤں کا بھی ذکر آیا ہے، جن کو اللہ کی طرف سے حکومت کی ذمہ داری سونپی گئی، گرچہ انسانی زندگی کے اس طویل دورانیہ میں نظام حکومت کی تفصیل نہیں ملتی؛ لیکن حکومتوں کا وجود اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ اس دور میں بھی کوئی نظام ضرور موجود تھا اور یقیناً ان آسمانی کتابوں اور پیغمبروں کے ذریعہ نظام سیاست سے متعلق اساسی افکار اور بنیادی خدوخال واضح کئے گئے ہوں گے۔

دنیا میں اس وقت جو مذاہب موجود ہیں، ان میں سے اکثر پر ایک ایسا دور گذر چکا ہے، جب سیاست کو مذہب کے تابع بنادیا گیا تھا، مگر بدقسمتی سے اس کو زیادہ تر مذہبی گروہوں نے عوام کے استحصال کے لئے استعمال کیا، ہندوستان میں ذات پات کی بنیاد پر تفریق کا اصل مقصد یہی تھا کہ چھتری عوام پر حکومت کریں، برہمن ان حکمرانوں کے حکمراں ہوں اور بقیہ لوگوں کا کام خدمت کرنا ہو، اس طرح برہمن پوری قوم کا استحصال کیا کرتے تھے اور انھوں نے مذہب کو آلۂ کار بنا کر اپنے لئے تقدس اور تفوق کا مقام حاصل کرلیا تھا، یہودی رِبّیوں کا حال یہ تھا کہ جن علوم کے بارے میں تورات میں صراحت موجود نہیں ہوتی، وہ ان میں اپنے مفادات کے مطابق قانون بناتے اور اس کی نسبت خدا کی طرف کرتے کہ ''یہووا'' (خدا) نے انھیں بتایا ہے، عیسائیت میں مذہبی رہنماؤں نے بتدریج اپنی ایک متوازی حکومت قائم کرلی تھی، وہ ایک طرف حکمرانوں کے واسطہ سے عوام پر حکومت کرتے تھے، دوسری طرف لوگوں سے مغفرت نامے فروخت کرتے تھے، یہاں تک کہ کلیسا اور حکومت کی وہ سرد جنگ پیش آئی، جو بالآخر کلیسا کی شکست پر منتج ہوئی، اسی پس منظر میں قرآن مجید نے کہا ہے کہ یہودیوں اور عیسائیوں نے اپنے علماء کو رب کا درجہ دے دیا ہے: ''اتَّخَذُوْا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَاباً مِّن دُونِ اللهِ''۔ (التوبۃ:۳۲)

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اُمت محمدیہ دنیا میں وہ واحد مذہبی گروہ ہے، جس کے پاس محفوظ شکل میں آسمانی کتاب بھی موجود ہے اور نبی کا اُسوہ بھی، جو زندگی کے دوسرے مسائل کی طرح نظام سیاست کے بارے میں بھی ہماری رہنمائی کرتا ہے، اسلام نے ہمیں دو بنیادی تصورات دیئے، اول یہ کہ اصل میں حاکمیت اللہ تعالیٰ کا حق ہے: ''إِنِ الْحُكْمُ إِلاَّ لِلّهِ'' (الانعام:۵۷) اور اس کی وجہ بھی بتائی گئی کہ انسان سمیت اس کائنات کا خالق اللہ ہے اور جو خالق ہوگا؛ چوں کہ وہ اپنی تمام مخلوقات کے نفع وضرر اور مصالح ومفاسد سے واقف بھی ہوگا؛ اس لئے وہی اس لائق

ہوسکتا ہے کہ ان کے لئے احکام بھی جاری کرے: ''أَلاَ لَهُ الْخَلْقُ وَالأَمْرُ''۔(الاعراف:۵۴)

اسی لئے قرآن مجید میں حکمراں کو 'خلیفہ' کے لفظ سے تعبیر کیا گیا؛ چنانچہ حضرت داؤد علیہ السلام کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا: ''إِنَّا جَعَلْنَاکَ خَلِیْفَةً فِیْ الْأَرْضِ ''(صٓ:۲۶) یہاں خلیفہ کے معنی یہ ہیں کہ وہ اللہ کی زمین پر اللہ کے احکام کو نافذ کرنے میں اللہ تعالیٰ کے نائب ہیں؛ پس اسلام کی نظر میں قانون کا اصل سرچشمہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، ہاں! جن احکام کے بارے میں کتاب وسنت میں کوئی ہدایت نہیں ملتی یا جن احکام کا تعلق ملک کے انتظامی اُمور سے ہے، ان میں انسان کے لئے قانون سازی کی گنجائش ہے؛ بشرطیکہ وہ شریعت کے بنیادی اُصول ومقاصد کے موافق ہو، اس سے متصادم نہ ہو، یہاں تک کہ قرآن کے بیان کے مطابق اللہ کے نبیوں اور پیغمبروں کو بھی، اپنی طرف سے کسی بات کو حلال وحرام کرنے کا حق نہیں تھا: ''لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللّٰهُ لَکَ''۔(التحریم:۱)

بہ قول شاعر حق شناس علامہ اقبالؒ :

سروری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی ، باقی بتانِ آزری

دوسرے: شریعت اسلامی میں حکومت کا مقصود صرف یہی نہیں ہے کہ ملک کے تمام شہریوں کو ایک نظم کے تحت لے آیا جائے، عوام کے لئے معاشی وسائل فراہم کئے جائیں، امن وامان قائم کیا جائے اور ملک کی سرحدوں کی حفاظت کی جائے؛ بلکہ اسلامی حکومت کا بنیادی مقصد بھلائیوں کی ترویج اور برائیوں کا سد باب ہے :

الَّذِیْنَ إِن مَّکَّنَّاهُمْ فِیْ الْأَرْضِ أَقَامُوْا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّکَاةَ وَأَمَرُوْا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنکَرِ وللهِ عَاقِبَةُ الْأُمُوْرِ . (الحج:۴۱)

نیکی کی ترویج اور برائی کی روک تھام میں ایک حکمراں کے لئے بنیادی اہمیت عدل وانصاف قائم کرنے کی ہے؛ چنانچہ حضرت داؤد علیہ السلام سے فرمایا گیا کہ انھیں خلیفہ اس لئے بنایا جارہا ہے کہ وہ لوگوں کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کریں :

یَا دَاوُوْدُ إِنَّا جَعَلْنَاکَ خَلِیْفَةً فِیْ الْأَرْضِ فَاحْکُم بَیْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ . (صٓ:۲۶)

رسول اللہ ﷺ نے اس کا عملی نمونہ پیش فرمایا، عرب کی ایک معزز خاتون کے خلاف آپ نے چوری کے جرم میں ہاتھ کاٹنے کا فیصلہ دیا، بعض رفقاء نے ایک معزز قبیلہ سے تعلق رکھنے کی بنا پر سزا کی تبدیلی کے لئے سفارش کی تو آپ نے ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا: خدا کی قسم! اگر بالفرض فاطمہؓ بنت محمد ﷺ نے بھی چوری کی ہوتی تو اس پر بھی یہی سزا نافذ کی جاتی: ''والله لو أن فاطمة بنت محمد سرقت لقطعت يدها''۔(۱)

(۱) بخاری، قبیل کتاب المناقب، حدیث نمبر: ۳۴۷۵۔

غرض کہ اسلام کے نظام سیاست میں حکومت کا بنیادی مقصد احکام خداوندی کو نافذ، عدل قائم کرنا، ظلم کو روکنا، بھلائیوں کو رواج دینا اور برائیوں کو مٹانا ہے؛ چنانچہ خود رسول اللہ ﷺ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ: ''وَإِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُم بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ إِنَّ اللهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ''۔(المائدۃ:۴۲)

حضرات ! یہ افسوس ناک حقیقت ہے کہ اگر چہ کہ قرآن وحدیث اور خلفاء راشدین کے طرز عمل میں ایک عادل حکومت کے لئے واضح اُصول اور بہترین معیارات کی نشاندھی کردی گئی ہے؛ لیکن اسلام کا معیاری نظام خلافت رسول اللہ ﷺ کے بعد تیس سال کے مختصر عرصہ سے زیادہ نہیں رہ سکا؛ اگر چہ بہت سے منصف مزاج اور خدا ترس سلاطین بھی پیدا ہوئے اور انھوں نے بڑی حد تک قرآن وحدیث کے منشاء کے مطابق حکومت کرنے کی کوشش کی؛ لیکن خزاں کے درمیان بہار کے یہ جاں فزا جھونکے ایک مستحکم سیاسی نظام کا نتیجہ نہیں تھے؛ بلکہ شخصی صلاح اور اخلاقی تعلیمات سے متاثر ہونے کا اثر تھا؛ اسی لئے ایسے بہت سے عدل پرور حکمراں گذرے ہیں کہ جن کے جانشیں اسی درجہ ظالم وجابر واقع ہوئے تھے۔

اس کا دوسرا نقصان یہ ہوا کہ نظام سیاست کے بارے میں فقہی کاوشیں بھی نسبتاً کم انجام پائیں، جہاں ہمیں عبادات کے موضوع پر بے شمار کتابیں ملتی ہیں اور خاندانی نظام اور مالی معاملات کے بارے میں دقت نظر کے ساتھ تمام امکانات پر غور کیا گیا ہے اور ان ممکنہ صورتوں سے متعلق احکام متعین کئے گئے ہیں، وہیں نظام سیاست پر بمشکل انگلیوں پر گنی جانے والی چند کتابیں ملتی ہیں، اور اس شعبہ سے متعلق فقہاء کے اجتہادات میں تسلسل نہ پائے جانے کی وجہ سے مختلف گوشوں میں تشنگی کا احساس بھی ہوتا ہے۔

حضرات ! شریعت اسلامی میں سیاسی نظام کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ شریعت کے بہت سے احکام کا نفاذ ایک اسلامی حکومت کے وجود پر موقوف ہے، نہ صرف حدود وتعزیرات، نظام قضاء، احتساب، دفع مظالم، مذہبی اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ، بین قومی تعلقات وغیرہ جیسے اہم اُمور حکومت سے متعلق ہیں؛ بلکہ عبادات میں بھی حکومت کو بہت کچھ دخل ہے، جمعہ وعیدین کی نمازیں اذنِ سلطان کے ساتھ مشروط ہیں، رمضان وعید اور حج کے لئے رؤیت ہلال کا اعلان سلطان یا اس کا نمائندہ کرے گا، اموال ظاہرہ جانوروں وغیرہ کی زکوٰۃ اور عشر وصول کرنا حکومت کا حق ہے، حج سلطان یا اس کے نائب کی امارت میں انجام دیا جائے گا، نماز اور نماز جنازہ کی امامت کا اولین مستحق سلطان ہے، اوقاف کی تولیت، نکاح کی ولایت اور زوجین میں تفریق وغیرہ کی ذمہ داری بھی بعض صورتوں میں سلطان سے متعلق ہوگی، غرضیکہ نہ صرف سلطنت کے انتظام، تعزیرات کے نفاذ، دفاع، خارجہ تعلقات اور داخلی امن وسلامتی وغیرہ میں حکومت کا بنیادی رول ہے؛ بلکہ عبادات اور خاندانی زندگی میں بھی حکومت کا دخل ہے، ان سب کے باوجود چوں کہ عملی طور پر اسلامی خلافت کو پنپنے کا موقع نہیں ملا اور نظام سیاست کی جزئیات پر کام

کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی، اس لئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مسلمان فقہاء نے اس جانب نسبتاً کم توجہ دی، ضرورت ہے کہ موجودہ دور کے علماء اس کمی کی تلافی کریں اور عصر حاضر کے تناظر میں ایک آئیڈیل اسلامی نظام کا عملی خاکہ پیش کریں۔

جب رسول اللہ ﷺ کی بعثت ہوئی، اس وقت دنیا پر بادشاہی کا نظام مسلط تھا، جزیرۃ العرب کے چاروں طرف روم وایران اور یمن میں یہی نظام کارفرما تھا، اس کے علاوہ اس عہد میں جن ملکوں کی تاریخ ملتی ہے، جیسے ہندوستان اور چین، وہاں بھی یہی شاہی نظام قائم تھا، اسلام نے ملوکیت کے اس نظام کو قبول نہیں کیا اور خلافت کا تصور پیش کیا، جس میں توارث کی بنیاد پر حکمرانی کا استحقاق تسلیم نہیں کیا گیا؛ بلکہ لیاقت، اخلاق وکردار اور عام مسلمانوں کے انتخاب کی بنیاد پر خلیفہ منتخب کئے جانے کا حکم دیا گیا، خود رسول اللہ ﷺ نے قیصر وکسریٰ کی سنت پر ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا اور ملوکیت کے تصور کو ختم کرنے کے لئے نہ آپ نے اپنے خاندان کے کسی فرد کو آئندہ کے لئے خلیفہ نامزد فرمایا اور نہ کسی اور رفیق کو، آپ ﷺ نے بعض اشارے ضرور دیئے اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو نماز کی امامت پر مقرر فرمایا، مگر آپ ﷺ نے صریح ہدایت نہیں دی اور اس کو اپنے رفقاء کی صوابدید پر چھوڑ دیا۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے بعد صحابہ کے مشورہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو نامزد فرمایا تھا؛ لیکن اپنی اولاد میں سے کسی کو اس ذمہ داری پر مقرر نہیں کیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے بعض لوگوں نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو سربراہ حکومت بنانے کا مشورہ بھی پیش کیا؛ کیوں کہ وہ ورع وتقویٰ میں امتیازی شان رکھتے تھے؛ لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے قبول نہیں فرمایا اور چھ افراد کے نام پیش کئے کہ مسلمان ان میں سے کسی کو اپنا امیر منتخب کرلیں، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد اکابر صحابہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کی، حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو آئندہ کے لئے حکمراں نامزد کرسکتے تھے اور وہ اپنی شرافت اور نسبی وجاہت کے اعتبار سے اکابر صحابہ کے لئے سب سے زیادہ قابل قبول بھی تھے؛ لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایسا نہیں کیا اور آپ رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد لوگوں نے اپنی مرضی سے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کی، غرض کہ تمام خلفاء راشدین کا اُسوہ یہی رہا ہے کہ انھوں نے اپنے بعد اپنی اولاد میں سے کسی کو جانشیں مقرر نہیں فرمایا، اس طرح یہ بات واضح کردی گئی کہ اسلام میں ملوکیت کا نظام قابل قبول نہیں ہے، علامہ ابن حزم نے لکھا ہے کہ اس پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ حکمرانی میں توارث جائز نہیں: ''**ولا خلاف بين أحد من أهل الإسلام في أنه لا يجوز التوارث فيها**''۔(۱)

بعض حضرات کو غلط فہمی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام کو حکمراں بنایا، اس سے ملوکیت کا جواز معلوم ہوتا ہے؛ لیکن ظاہر ہے کہ امر الٰہی پر امر انسانی کو قیاس نہیں کیا جاسکتا، حضرت سلیمان علیہ السلام

(۱) الفصل فی الملل والنحل:۵،ص:۱۲،قبیل ''الکلام فی عقد الامامة بماذا یصح''۔

کوحضرت داؤد علیہ السلام نے حکمراں نامزد نہیں کیا تھا؛ بلکہ خود اللہ تعالیٰ نے اس منصب پر فائز فرمایا تھا، اس کے علاوہ حضرت سلیمان علیہ السلام اپنی لیاقت کے اعتبار سے بھی تمام لوگوں پر فائق تھے؛ کیوں کہ وہ نبی تھے اور نبی علم وفضل اور عمل واخلاق کے اعتبار سے تمام لوگوں پر فائق ہوتا ہے اور اس کی حیثیت زمین پر اللہ کے نمائندہ کی ہوتی ہے۔

اسی طرح حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے بعد چھ افراد کو جو نامزد فرمایا، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہمیشہ نامزدگی کے ذریعہ حکمراں منتخب کیا جائے، اگر اس نامزدگی میں توارث نہیں ہو، تب بھی اس سے آمریت جنم لیتی ہے، اس وقت دنیا میں جتنے امراء اور ڈکٹیٹر موجود ہیں، سب ایسے ہی ہیں کہ یا تو انھوں نے اپنے کسی قرابت دار سے اقتدار حاصل کیا ہے یا انھیں سابق حکمراں فوج یا خود ساختہ حکمرانوں کی ٹولی نے کرسیٔ اقتدار پر فائز کیا ہے، پھر تاریخی روایات کا جائزہ لیا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے صرف اپنی رائے سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو نامزد نہیں کیا؛ بلکہ صحابہ کے مشورہ سے کیا اور صرف اس نامزدگی کی وجہ سے نامزد شخص کو خلافت حاصل نہیں ہوئی، اگر ایسا ہوتا تو بیعت کی ضرورت نہیں پڑتی؛ بلکہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں پر بیعت کی گئی، تب وہ خلیفہ قرار پائے، گویا نامزدگی کی حیثیت مشورہ کی تھی نہ کہ واجب الطاعۃ حکم کی؛ کیوں کہ کسی امیر کا حکم اس کی زندگی میں ہی واجب العمل ہوتا ہے، اس کی وفات کے بعد واجب العمل باقی نہیں رہتا: ''**إن إمامة معهود إليه تنعقد بعد موته باختيار أهل الوقت**''۔(۱)

اس لئے حقیقت یہ ہے کہ ملوکیت اسلام کے سیاسی تصورات سے ہم آہنگ نہیں ہے؛ البتہ امن عامہ اور روز مرہ کے مسائل کے حل کے لئے نظم مملکت کا قائم رہنا ضروری ہوتا ہے؛ ورنہ معاشرہ بدامنی اور شر وفساد کا شکار ہوجائے گا، اس لئے فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص زور زبردستی سے اقتدار پر مسلط ہوجائے اور اس کے خلاف بغاوت کرنے کی صورت میں اندیشہ ہو کہ یہ مہم ناکام ہوجائے گی اور اس سے مزید فتنہ وفساد پھیلے گا تو ایسی صورت میں اس اقتدار کو تسلیم کر لینے کی گنجائش ہے، اسی کو بعض فقہاء نے 'امارت قاہرہ' سے تعبیر کیا ہے، اسی بنیاد پر علماء نے بادشاہوں کی اطاعت کی ہے، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ آئیڈیل طرز حکومت ہے اور اسلام کی نظر میں قابل قبول ہے؛ بلکہ اس کا منشاء صرف ایک ضرورت کی تکمیل اور فتنہ وفساد کو روکنا ہے، اس کی بنیاد پر زور زبردستی سے لائی گئی ملوکیت یا آمریت کو جائز نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔

حضرات ! موجودہ دور میں جو سیاسی نظام سکہ رائج الوقت بن چکا ہے، جسے مقبول نظام حکومت کا درجہ حاصل ہے اور جو اس وقت عالم اسلام اور عالم عرب پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کے مرحلہ میں ہے، وہ ہے جمہوریت، یہ یقیناً اسلام کے سیاسی نظام سے چند جہتوں میں بے حد مختلف ہے، اول یہ کہ اس نظام میں کسی اُمیدوار کے صرف

(۱) الاحکام السلطانیۃ لأبی یعلی: ۲۶۔

عددی اکثریت حاصل کرنے کو ہی کافی سمجھا جاتا ہے؛ لیکن اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ کسی ذمہ داری کے حوالہ کئے جانے میں ضروری ہے کہ وہ اس کا اہل بھی ہو، اور اہلیت میں دو باتیں بنیادی اہمیت کی حامل ہیں، ایک یہ کہ وہ مفوضہ کام کی صلاحیت رکھتا ہو، صاحب علم ودانش ہو، دوسرے اس سے اپنی ذمہ داریوں کے بارے امانت ودیانت کی اُمید رکھی جاسکتی ہو: ''إِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَأْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْأَمِينُ ''(القصص:۲۶) اور حکمراں بھی اپنی ذمہ داری کے اعتبار سے رعایا کا اجیر ہی ہوتا ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''لاَ يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ ''(البقرۃ:۱۲۴) پس اسلامی نظام میں یہ ضروری ہے کہ حکمرانوں اور عوامی نمائندوں کے لئے علم وعمل اور اخلاق وکردار کے اعتبار سے ایک معیار مقرر ہو، صرف 51% تائید حاصل کرلینا کافی نہیں۔

دوسرا اہم فرق یہ ہے کہ جمہوری نظام میں ایک شخص اپنے آپ کو اُمیدوار بناتا ہے؛ لیکن اسلامی نقطۂ نظر سے اپنے آپ کو عہدہ واقتدار کے لئے اُمیدوار بنانا جائز نہیں، رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع کیا ہے اور یہ بھی فرمایا ہے کہ جو عہدہ کا اُمیدوار ہوگا، اسے میں عہدہ نہیں دوں گا۔

تیسرا فرق یہ ہے کہ جمہوریت میں قانون کا سرچشمہ عوام کو مانا گیا ہے، مثلاً اگر 51% فیصد عوام چاہتے ہوں کہ شراب کے کارخانے بنائے جائیں اور شراب پر کوئی پابندی نہ ہو تو شراب کی تمام تر اخلاقی اور طبعی مضرتوں کے باوجود اس کی اجازت دی جائے گی، اسلام کی نظر میں قانون کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، انسان کا کام قانون کی تشریح وتوضیح ہے نہ کہ قانون سازی؛ اس لئے کتاب وسنت کے مقابلہ میں کوئی قانون سازی نہیں ہوسکتی۔

تاہم جمہوری نظام چوں کہ ایک بندھا، ٹکا اور متعین ومحدود نظام نہیں ہے؛ بلکہ مختلف ملکوں نے اپنے اپنے مصالح اور عوامی رجحانات کے اعتبار سے اس کو اختیار کرنے میں فرق بھی کیا ہے؛ اس لئے اسے اسلام سے ہم آہنگ بھی کیا جاسکتا ہے، مثلاً سربراہوں اور پارلیمنٹ کے ممبروں کے لئے ایک معیار مقرر کیا جاسکتا ہے کہ اس معیار کے حامل لوگ ہی منتخب کئے جاسکتے ہیں، ایسا ہوسکتا ہے کہ لوگ خود اپنے آپ کو اُمیدوار نہ بنائیں، پارٹیاں ان کو اُمیدوار بنائیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ دستور میں کتاب وسنت کو بنیاد قرار دیتے ہوئے پارلیمنٹ کو صرف ایسے اُمور میں قانون سازی کی اجازت دی جائے، جو انتظام وانصرام سے متعلق ہوں نہ کہ حلال وحرام سے، اس طرح یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ موجودہ جمہوری نظام اسلام کے تصور خلافت سے قریب تر ہے، آج اگر کسی خطہ میں اسلامی طرز حکومت کو وجود میں لانے کا موقع میسر ہو تو اس کی صورت یہی ہوسکتی ہے کہ رائے عامہ سے شوریٰ کے ارکان منتخب ہوں اور یہ ارکان سربراہ حکومت کا انتخاب عوامی نمائندوں کی حیثیت سے کریں یا یہ کہ عوام شوریٰ کے لئے ارکان کا بھی انتخاب کریں اور براہ راست صدر مملکت کا بھی؛ تاکہ ملوکیت اور آمریت کے چنگل سے عالم اسلام کو آزادی نصیب ہو۔

حضرات ! اسلام کے نظام سیاست سے مربوط بعض مسائل فقہی نوعیت کے ہیں، جن پر موجودہ حالات

کے تناظر میں غور کرنے کی ضرورت ہے اور علماء کو چاہئے کہ ایک ایسے وقت میں جب کہ عالم اسلام میں انقلاب کی لہریں موجزن ہیں، ان کو فرضی مسئلہ تصور نہ کریں، ان پر گہری بصیرت کے ساتھ غور کریں اور وہ احکام جو کسی خاص زمانہ کے احوال اور مصالح کے تناظر میں فقہاء نے دیئے ہیں، بدلے ہوئے حالات میں شریعت کے بنیادی مقاصد اور اُصول کو سامنے رکھ کر ان کے بارے میں فیصلہ کریں۔

جیسے سربراہ مملکت کے قریشی ہونے کا مسئلہ ہے، رسول اللہ ﷺ نے بے شک فرمایا ہے: ''**الأئمة من قريش**'' لیکن اس میں اختلاف رہا ہے کہ یہ رسول اللہ ﷺ کی پیشین گوئی تھی کہ قریش ایک عرصہ تک سربراہِ مملکت ہوتے رہیں گے یا یہ ارشاد بطور حکم کے تھا؟ اور اگر یہ حکم کے طور پر تھا تو یہ ایک خاص مصلحت کے تحت وقتی حکم تھا؛ کیوں کہ عربوں میں قریش کو تفوق کی نظر سے دیکھا جاتا تھا اور اس وقت قریشیوں کے علاوہ کسی اور کی قیادت پر لوگ متفق نہیں ہوسکتے تھے، یا قیامت تک کے لئے یہی حکم ہے؟ یہ بات قابل غور ہے؛ کیوں کہ ہمیں حضور ﷺ کا یہ ارشاد بھی ملتا ہے کہ اگر کوئی ناک کٹا حبشی غلام بھی تم پر امیر بنادیا جائے تو اس کی بھی اطاعت کرو، اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی وفات کے وقت اظہار حسرت کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر معاذ ابن جبل رضی اللہ عنہ اس وقت زندہ ہوتے تو میں انھیں خلیفہ بنادیتا، اور ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ کے آزاد کردہ غلام سالم رضی اللہ عنہ ہوتے تو انھیں خلیفہ بنادیتا؛ حالاں کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ انصار میں تھے اور سالم موالی میں، نیز عباسیوں اور فاطمیوں کے بعد عجمی نژاد فرماں روا ہوئے اور سبھوں نے ان کی خلافت کو تسلیم کیا؛ اسی لئے فقہاء نے قریشی ہونے کی شرط کو مختلف فیہ قرار دیا ہے اور خود امام ابوحنیفہؒ کا ایک قول نقل کیا گیا ہے کہ ان کے نزدیک قریشی ہونا شرط کے درجہ میں نہیں تھا: ''**لا يشترط في صحة تولية السلطان أن يكون قريشيا**''۔(۱)

موجودہ دور میں لوگوں کی سوچ گذشتہ ادوار سے بالکل مختلف ہوگئی ہے، یعنی اُس زمانہ میں حکمرانوں کو قبول کرنے کے لئے خاندانی نسبت کو بے حد اہمیت حاصل تھی؛ لیکن ہمارے اِس عہد میں حکمرانی کو کسی خاندان میں محدود کردینا لوگوں کے لئے ناقابل قبول ہے۔

دوسرا مسئلہ مدتِ حکومت کی تحدید کا ہے، خلافتِ راشدہ کے عہد میں جن شخصیتوں کو امیر منتخب کیا گیا، وہ تاوفات اپنی اس ذمہ داری پر قائم رہے، اگر واقعی ابوبکر وعمر، عثمان وعلی رضی اللہ عنہم جیسے لوگ اُمت کو ہر دور میں ملتے رہیں تو ان کی حیات کتنی بھی دراز ہو، اُمت کے لئے ان کی امارت قائم رہنے میں ہی خیر ہے؛ لیکن ہر حکمراں کے بارے میں یہ بات نہیں کہی جاسکتی، عام طور پر اقتدار کا تسلسل مزاج میں بگاڑ پیدا کردیتا ہے، قرآن مجید میں جن ظالم حکمرانوں کا ذکر آیا ہے، ان کا معاملہ یہی تھا کہ طویل حکمرانی کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو عوام کا مالک یہاں تک کہ 'خدا'

(۱) شرح الحموی علی الأشباہ والنظائر:۲۶۶/۲،الفن الثالث۔

تصور کرنے لگے تھے، موجودہ دور میں کسی شخص کو پوری زندگی کے لئے فرماں روا بنادیا جائے تو ظن غالب یہی ہے کہ وہ اپنے عہد کے حسنی مبارک، معمر قذافی، بشار الاسد اور صدام حسین بن جائیں اور پوری قوم کو اپنی زرخرید ملکیت تصور کرنے لگیں؛ اس لئے موجودہ عہد میں عوامی نمائندوں اور منتخب سربراہوں کے لئے بھی مدت کی تحدید ضروری ہے، اسکی فقہی اصل یہ ہے کہ اصل میں حکمراں کی حیثیت عوام کے وکیل کی ہوتی ہے، عوام انھیں انتظامی اُمور کی ذمہ داری سونپتے ہیں —— اسی بنیاد پر امیر کو ولایت عامہ حاصل ہوتی ہے —— اور مؤکل کو یہ حق ہوتا ہے کہ وہ اپنے وکیل کے لئے ایک مدت کار مقرر کردے یا اس کے اختیارات کی تحدید کردے۔

اسی طرح ایک مسئلہ 'صدرِ مملکت' کے اختیارات کا بھی ہے، اللہ تعالیٰ نے امیر کو لوگوں سے مشورہ کرنے کا حکم دیا ہے: ''وَشَاوِرْهُمْ فِيْ الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللهِ'' (آل عمران:۱۵۹) لیکن مشورہ کی کیا حیثیت ہوگی، امیر مشورہ کا پابند ہوگا یا خود فیصلہ کرے گا؟ اس کی وضاحت نہیں کی گئی، ایسی مثالیں بھی مل جاتی ہیں کہ امیر نے تنہا اپنے مشورہ پر عمل کیا ہے، جیسے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا مانعین زکوٰۃ سے جہاد کرنا، اور ایسی مثال بھی موجود ہے کہ امیر نے اپنے آپ کو اکثریت کے مشورہ کا پابند رکھا جیسا کہ غزوۂ احد کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے نوجوانوں کی رائے پر مدینہ سے باہر نکل کر جہاد کرنے کا فیصلہ کیا۔

عام طور پر فقہاء کا رجحان یہی محسوس ہوتا ہے کہ امیر شوریٰ کے مشورہ کا پابند نہیں ہے؛ یہ کہنا مشکل ہے کہ فقہاء کی یہ رائے مجبور کن حالات پر مبنی تھی؛ کیوں کہ اس زمانہ میں حکمراں باضابطہ کوئی شوریٰ رکھتے ہی نہیں تھے، جس کے مشورہ پر عمل ہو، اور بادشاہ کے منشاء کے خلاف کوئی مشورہ پیش کرنے میں بھی جان کا جوکھم ہوتا تھا، یا ان کے یہاں بنیادی حکم ہی یہی تھا؛ لیکن بہر حال موجودہ دور میں کسی فرماں روا کو ایسا مطلق العنان بنادینا قوم کے گلے میں غلامی کا طوق پہنادینے کے مترادف ہوگا، جس کا تجربہ خلافت راشدہ کے بعد مسلم حکومتوں کی طویل تاریخ میں کیا جاچکا ہے، جہاں امارت نے آمریت کی شکل اختیار کرلی اور جس کے منفی اثرات آج بھی مسلم ملکوں میں دیکھے جاسکتے ہیں؛ اس لئے جیسے دوسرے معاملات میں مؤکل اپنے وکیل کے اختیارات کو محدود کرسکتا ہے، اس معاملہ بھی اس کی گنجائش ہونی چاہئے کہ سربراہ مملکت کے اختیارات کو محدود رکھا جائے اور وہ عوام کے منتخب نمائندوں کے مشورہ کا پابند رہے۔

ایک اہم اور قابل غور مسئلہ یہ بھی ہے کہ ہمارے فقہاء تو پوری دنیا میں ایک ہی خلیفہ اور امیر کا تصور رکھتے تھے، یعنی مسلم مملکت کی حدود چاہے دنیا کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک پہنچ جائیں؛ لیکن وہ ایک ہی حکمراں کے تحت رہیں گے، اسلام کے قرن اول میں مسلمانوں کی حکومت ایشیاء سے نکل کر یورپ وافریقہ تک پہنچ چکی تھی؛ لیکن یہ وسیع وعریض مملکت ایک ہی فرماں روا کے زیر سایہ قائم تھی اور اب تو مواصلات اور ابلاغ کے ذرائع اس قدر

ترقی کر گئے ہیں کہ یہ بات نسبتاً آسان ہوگئی ہے۔

تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ غالباً عباسی دور سے ہی مملکت اسلامیہ کی وحدت ختم ہوگئی تھی اور اس سے پہلے بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں شام وعراق کی دو الگ الگ مملکتیں بن گئی تھیں اور دونوں سلطنتوں کو بعض اکابر صحابہ کی تائید حاصل تھی، غالباً اسی لئے ابتدائی دور سے ہی ایک گروہ ایک ہی وقت میں ایک سے زیادہ مسلم مملکتوں اور ہر مملکت کے لئے الگ الگ سربراہوں کا قائل تھا، اگرچہ علامہ ماوردی نے اپنی معروف کتاب 'الاحکام السلطانیہ' میں اسے قول شاذ قرار دیا ہے، ایک اور تصور بھی تھا کہ اگر مملکت کی وسعت نظم ونسق میں حارج ہو تو سلطنت کے انتظامات اور دفاع کے اُمور کو آسان بنانے کے لئے ایک سے زیادہ حکومتیں اور ان کے الگ الگ سربراہ ہو سکتے ہیں؛ چنانچہ علامہ عبدالقادر بغدادی فرماتے ہیں کہ ایک وقت میں دو سربراہ نہیں ہونے چاہئیں، سوائے اس کے کہ ان دونوں خطوں کے درمیان ایسا سمندر حائل ہو کہ ایک طرف کے لوگ دوسری طرف کے لوگوں کو اپنی مدد نہ پہنچا سکیں، ایسی صورت میں دونوں علاقوں کے لوگوں کے لئے الگ الگ امیر منتخب کئے جا سکتے ہیں :

..... **إلا أن يكون بين البلدين مانع من وصول نصرة أهل كل واحد منهما إلى الآخر فيجوز حينئذ لأهل كل واحد منهما عقد الإمامة لواحد من أهل ناحيته .(۱)**

اور یہی بات اسلامی نظام سیاست کے سب سے بڑے ماہر اور نامور مفکر امام الحرمین علامہ جوینیؒ نے بھی لکھی ہے۔(۲)

اس لئے ایک آئیڈیل اور مثالی اسلامی مملکت تو وہی ہوگی، جو پوری ملت اسلامیہ کو ایک لڑی میں پرو دے؛ لیکن آج کی دنیا کا پھیلاؤ اور قومی عصبیتوں کے مرض کی وجہ سے عملاً یہ بات ممکن نہیں ہے، اگر ایسی کوشش کی گئی تو خطرہ ہے کہ عالم اسلام میں ایک نہ ختم ہونے والی خونریز جنگ شروع ہو جائے گی، جو بعض خطوں میں پہلے ہی سے جاری ہے، جیسے بعض فقہاء نے ایک ہی شہر میں تعدد جمعہ کو منع کیا تھا؛ لیکن بعد میں بڑھتی ہوئی آبادی کے پس منظر میں اس کی اجازت دی گئی، اسی طرح موجودہ حالات میں تعدد مملکت کو قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔

موجودہ دور میں خواتین کے حقوق کی بازیابی اور ان کی آزادی کے پُرفریب نعرہ کی بازگشت پوری دنیا میں سنی جارہی ہے اور جن لوگوں نے عورتوں کے ناموس کو سامان تجارت بنا دیا ہے، بدقسمتی سے وہی خواتین کے حقوق کے سب سے بڑے پاسدار سمجھے جارہے ہیں، اس تحریک نے جو مادی مقاصد کے لئے شروع کی گئی ہے، پوری دنیا کو متاثر کیا ہے، مسلمان بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں، اس پس منظر میں یہ سوال کھڑا ہوتا ہے کہ کیا خواتین کسی مسلمان

(۱) اصول الدین: ۲۷۴۔ (۲) دیکھئے: تفسیر قرطبی: ۱/۲۷۳۔

حکومت میں رکن پارلیمنٹ ہوسکتی ہیں؟ اگر چہ اس سلسلے میں دورائیں ہوسکتی ہیں؛ لیکن موجودہ صورت حال میں کہا جاسکتا ہے کہ فی الجملہ اس کی گنجائش ہے؛ کیوں کہ شریعت میں اس بات کو تو منع کیا گیا ہے کہ فیصلے کے تمام تر اختیارات عورتوں کے حوالہ کردیئے جائیں: ''لن یفلح قوم ولوا أمرهم امرأة ''(۱) لیکن مشورہ دینا فیصلہ کرنا نہیں ہے اور خواتین سے مشورہ لینے میں کوئی مانع نہیں ہے؛ بشرطیکہ وہ ایسی مجلسوں میں شرعی حدود کی رعایت کے ساتھ شرکت کریں؛ چنانچہ یہ بات تاریخ کے صفحات پر موجود ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد خلیفہ کے انتخاب کے سلسلے میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے خواتین سے بھی مشورے کئے تھے۔

اسی طرح اس دور میں ایک اہم مسئلہ پارلیمنٹ میں مذہبی اقلیتوں کی نمائندگی کا بھی ہے، اس سلسلے میں بھی یہ بات ملحوظ رکھنے کی ہے کہ پارلیمنٹ کا ہر رکن اپنی انفرادی حیثیت میں صرف مشورہ دینے کا مجاز ہوتا ہے، فیصلہ کرنے کا نہیں، فیصلہ تو غلبہ آراء سے ہوگا، پس اگر مسلمان ملکوں میں مجلس شوریٰ میں غیر مسلم نمائندے ہوں، وہ اقلیتوں کے مسائل پر بحث میں حصہ لیں اور عام انتظامی اور مالیاتی مسائل میں مشورہ دیں تو اس میں کوئی حرج نظر نہیں آتا؛ البتہ جو شرعی مسائل احکام قطعیہ کے درجہ میں ہوں، ان میں تو مشورہ کی گنجائش ہی نہیں ہے اور جو اجتہادی مسائل ہیں، ان میں بھی فیصلہ کرنے کے مجاز علماء وفقہاء ہیں، صرف ان کی تنفیذ کے طریقہ کار پر مجلس شوریٰ میں بحث ہوسکتی ہے، ایسے مسائل میں انکا ووٹ مؤثر نہیں مانا جائے گا؛ کیوں کہ یہ مذہب سے مربوط مسلمانوں کے مسائل ہیں، اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ عصر حاضر کے پس منظر میں اسلامی نظام سیاست کی تشکیل کرتے ہوئے حکومت میں اقلیتوں کو بھی حصہ دار بنایا جاسکتا ہے؛ بلکہ بنایا جانا چاہئے۔

حضرات ! اس عہد میں ایک طرف ماہرین علم سیاست نے یہ تصور کرلیا کہ اسلام کے سیاسی تصورات موجودہ ترقی یافتہ دور میں قابل عمل نہیں ہیں، دوسری طرف علماء اور اصحاب افتاء نے اس کو علم وفکر کی دنیا کا ایک بند باب سمجھ کر اس پر غور کرنا چھوڑ دیا؛ حالاں کہ جب رسول اللہ ﷺ پر نبوت کا سلسلہ تمام ہو چکا اور آپ کی ہدایات قیامت تک انسانیت کے لئے زندگی کے تمام مسائل میں رہنمائی کا فریضہ انجام دیتی رہیں گی تو یہ کیوں کر ممکن ہے کہ اجتماعی زندگی کا ایک ایسا شعبہ جس سے ہر فرد اپنی انفرادی اور اجتماعی حیثیت میں مربوط ہے اور جس پر بہت سے احکام شریعت کی تنفیذ موقوف ہے، پر غور وفکر نہ کیا جائے، یہاں تک کہ اس پر تبادلہ خیال کرنے سے بھی گریز کیا جانے لگے۔

اسی لئے اسلامک فقہ اکیڈمی نے اس اہم موضوع کو آپ اہل دانش اور اصحاب فکر ونظر کی بارگاہ میں پیش کیا ہے؛ تاکہ اس فراموش کردہ موضوع پر شریعت اسلامی کے ماہرین متوجہ ہوں، یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اس سیمینار میں

(۱) بخاری، کتاب الفتن، باب الفتنة التی تموج کموج البحر، حدیث نمبر: ۶۶۸۶۔

مطلوبہ اسلامی نظام سیاست پر گفتگو کی جارہی ہے، جس کی عملی طور پر مسلم اکثریت خطہ ہی میں تطبیق ہوسکتی ہے؛ لیکن اکیڈمی اس سے پہلے اپنے 'چودھویں سالانہ فقہی سمینار' میں ان سیاسی مسائل کو زیر بحث لاچکی ہے، جو مسلمان اقلیتوں کو درپیش ہیں، جو غالباً برصغیر میں اس موضوع پر پہلا نمائندہ سیمینار تھا اور اس کے فیصلوں کو توازن اور واقعیت کی وجہ سے ہر جگہ پزیرائی حاصل ہوئی۔

اس وقت جو سیمینار منعقد ہورہا ہے، انشاء اللہ اس میں بڑے اہم موضوعات زیر بحث آئیں گے ، جیسے یہ کہ ملوکیت کے بارے میں اسلامی تصور کیا ہے اور کیا اسلام موروثی نظام حکومت کو قبول کرتا ہے؛ تاکہ اس بات کا تجزیہ کیا جاسکے کہ مسلم ممالک میں بادشاہت کا طویل عہد دوسری اقوام سے متاثر ہونے کا نتیجہ ہے، یا شریعت اسلامی نے ان کو یہی تعلیم دی ہے؟ اسی طرح شوریٰ کی رائے کو اختیار کرنے کا مسئلہ ہے، جس کی طرف اس حقیر نے ابھی اشارہ کیا ہے، یہ موضوع بھی بڑا اہم ہے کہ موجودہ جمہوری نظام کے اصولوں پر کس طرح ایک اسلامی حکومت کی تشکیل عمل میں آسکتی ہے، اس طرح کے متعدد مسائل —— انشاء اللہ —— آپ کے مقالات اور مناقشات میں زیر بحث آئیں گے، جو عصری تناظر میں بے حد اہمیت کے حامل ہیں۔

حضرات ! علی گڑھ میں اس پروگرام کے انعقاد کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ ہم نے جدید وقدیم اور علماء ودانشوروں کے درمیان جو مصنوعی دیوار کھڑی کردی ہے اور جو بہ تدریج اتنی اونچی ہوتی جارہی ہے کہ ہم ایک دوسرے کی طرف دیکھ بھی نہیں سکتے، اسے 'دیوار برلن' کی طرح گرادیا جائے، ہم ایک دوسرے سے فائدہ اُٹھائیں اور باہمی اشتراک کے ساتھ ملت کو سربلند کرنے کی کوشش کریں، مجھے اس موقع پر شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کے وہ فقرے یاد آرہے ہیں، جو انھوں نے ۲۹/اکتوبر ۱۹۲۰ء کو علی گڑھ ہی میں فرمائے تھے، جس کا ایک ایک حرف درد وسوز میں ڈوبا ہوا ہے اور خونِ جگر میں قلم ڈبو کر لکھا گیا ہے :

> اے نونہالانِ وطن ! جب میں نے دیکھا کہ میرے درد کے غمخوار (جس سے میری ہڈیاں پگھلی جارہی ہیں) مدرسوں، خانقاہوں میں کم اور اسکولوں اور کالجوں میں زیادہ ہیں تو میں نے اور میرے مخلص احباب نے ایک قدم علی گڑھ کی طرف بڑھایا اور اس طرح ہم نے ہندوستان کے دو تاریخی مقاموں دیوبند اور علی گڑھ کا رشتہ جوڑا۔

افسوس کہ شیخ الہند کی یہ تحریک کما حقہ آگے نہ بڑھ سکی، تاہم 'آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ' کے قیام نے عوامی سطح پر اور 'اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا' کے قیام نے فکری سطح پر جدید وقدیم کے درمیان خلیج کو کم کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے، اُمید ہے کہ یہ اور اس طرح کے پروگرام اس کو مزید تقویت پہنچائیں گے کہ ہم سب اُمت کا اثاثہ ہیں اور ہم سب کا کعبۂ مقصود اللہ کی رضاء وخوشنودی اور اسلام کی سرفرازی وسربلندی ہے۔

میں بے حد شکر گزار ہوں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور بالخصوص اس کے شعبہ سیاسیات کا، جس نے اسلامک فقہ اکیڈیا کے اشتراک سے یہ اہم سیمینار منعقد کیا، مجھے اُمید ہے کہ یہ سیمینار نہ صرف اسلام کے سیاسی نظام کے خد وخال واضح کرنے میں معاون ثابت ہوگا اور اس پر غور وفکر اور بحث وتحقیق کا محرک بنے گا؛ بلکہ علماء اور جدید تعلیم یافتہ حضرات کے درمیان فاصلوں کو سمیٹنے اور علمی وفکری مسائل میں ایک دوسرے سے افادۂ واستفادہ کو وسعت دینے میں بھی ایک اہم رول ادا کرے گا، دُعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سیمینار کو صحیح نتائج پر پہنچنے کا ذریعہ بنائے۔

وباللہ التوفیق وھو المستعان .

○ ○ ○